۷

سالکین کو روحانی مراتب کے حصول کے متعلق ایک اہم ہدایت

(فرمودہ ۲۳- فروری ۱۹۳۴ء)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا-

میں نے غالبًا پچھلے سے پچھلے جمعہ میں معاملات کی درستی کے متعلق ایک خطبہ پڑھا تھا اور اس میں خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کو توجہ دلائی تھی جنہوں نے میری تحریک کے مطابق اس امر پر آمادگی کا اظہار کیا کہ وہ اپنی بھی اصلاح کریں گے اور جماعت کے دوسرے افراد کی اصلاح کی کوشش بھی کریں گے- اسی بارے میں مَیں آج بعض مزید باتیں بیان کرنی چاہتا ہوں- تکمیل یا کمال ایک ایسا لفظ ہے کہ ان دونوں کا مفہوم ہمیشہ نسبتی رنگ میں ہوا کرتا ہے اور گو ہر حقیقت جو ہم جانتے ہیں یا ہر لفظ جس کا ہمیں علم ہے نسبتی ہی ہوتا ہے مگر ان الفاظ کے متعلق خصوصیت کے ساتھ یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ نسبتی امور ہوتے ہیں- اور ایک چیز جو اپنے سے ادنیٰ چیز کی نسبت اعلیٰ ہوتی ہے، وہ اپنے سے اعلیٰ چیز کی نسبت ناقص ہوتی ہے- یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور بڑے سے بڑا انسان خواہ وہ نبی یا رسول ہی کیوں نہ ہو، اپنی کمزوریوں پر استغفار کرتا ہے- ایک نادان اور بیوقوف شخص استغفار کو اپنی حالت پر قیاس کرکے قابلِ اعتراض قرار دیتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ استغفار اللہ تعالیٰ کی ذات کے مقابلہ میں ہوتا ہے- کمال کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ روحانی اور مذہبی زبان میں کمال کے معنی یہ ہوا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات انسان کے آئینۂ قلب میں منعکس ہوجائیں- اور نقص کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے انعکاس میں کمی آجائے یا کمی باقی رہ جائے-

ہم یہ تسلیم کرسکتے ہیں کہ ایک انسان اپنے مقام کے لحاظ سے صفاتِ الٰہیہ کو کامل طور پر ظاہر کررہا ہو جس طرح ایک تیز نگاہ والا انسان اگر دو میل کے فاصلہ سے ایک چیز کو اس طرح دیکھ لے جس طرح اتنے فاصلہ سے اسے دیکھا جاسکتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی آنکھ میں اس چیز کا پورا نقشہ آگیا لیکن جب ہم یہ کہیں گے تو اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ چیز کا اصل نقشہ پوری طرح اس کی آنکھ میں آگیا بلکہ یہ ہوں گے کہ دو میل کے لحاظ سے جس قدر نقشہ آسکتا تھا وہ آگیا- اب اگر وہی چیز ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر آجائے تو آنکھ اسے پہلے سے زیادہ نمایاں صورت میں دیکھے گی- مگر دو میل والی حالت ناقص نہیں کہلائے گی کیونکہ اس کے لئے اتنا ہی امکان تھا- پس اگر اصل چیز دیکھی جائے گی تو اس کے لحاظ سے آنکھ کا یہ نقص ہوگا کہ وہ اسے پورے طور پر نہ دیکھ سکی- اور اگر یہ دیکھا جائے گا کہ ڈیڑھ یا دو میل کے فاصلہ سے جس حد تک آنکھ دیکھ سکتی تھی اُس قدر اُس نے دیکھ لیا تو یہ آنکھ کا کمال ہوگا- یہی حال استغفار کا ہے- انبیاء اپنی ذات میں کامل ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے جلال اور جبروت کو دیکھ کر وہ مزید ترقیات کی خواہش کرتے ہیں- گویا استغفار ان کے کسی نقص پر دلالت نہیں کرتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے مقابلہ میں ہوتا ہے- مثلاً ایک کنواں سَو ہاتھ گہرا ہو اگر کوئی شخص اُس سے پانی نکالتا ہے تو اُسے یقیناً کچھ دیر لگے گی لیکن اگر وہ پوری انسانی طاقت سے کام لے کر اتنی جلدی پانی نکال لیتا ہے جس حد تک جلدی نکالا جاسکتا ہے تو اس لحاظ سے وہ کامل ہوگا- لیکن اگر دوسرا شخص ایک اور کنویں سے جو پچاس ہاتھ گہرا ہو زیادہ جلدی پانی نکال لیتا ہے تو پانی جلدی نکلنے کے لحاظ سے پہلے میں نقص سمجھا جائے گا مگر یہ حالات کی طرف منسوب ہوگا- یہی چیز ہے جس کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام یا وہ صلحاء و اولیاء جو اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آجاتے ہیں، خواہ وہ ابتدائے عمر میں اس کی حفاظت میں آجائیں یا آخر عمر میں، استغفار کرتے ہیں- یہ استغفار اُن کی غفلتوں کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ حالات کے لحاظ سے ہوتا ہے کیونکہ جب وہ خداتعالیٰ کی بلند ترین شان کو دیکھتے ہیں تو اُس کی عظمت و شان کے مقابلہ میں اپنے آپ میں نقص محسوس کرتے اور استغفار کرتے ہیں- جس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ خدا کے اور زیادہ قریب ہونا چاہتے ہیں- کنواں اگر سَو ہاتھ گہرا ہو اور کوئی انسان اُس کی تہہ تک پہنچنا چاہے تو وہ پہنچ سکتا ہے- اگر ایک وقت سَو ہاتھ ہو تو دوسرے وقت جبکہ انسان کنویں میں اُتر رہا ہو نوّے پھر اسّی اور پھر ستر ہاتھ رہ جائے گا- یہاں

تک کہ کچھ بھی فاصلہ باقی نہیں رہے گا کیونکہ سَو ہاتھ آخر محدود تعداد ہے- لیکن اللہ تعالیٰ کی صفات غیر محدود ہیں اس لئے خدا تعالیٰ کی جبروت کے مقابلہ میں انسان کسی وقت بھی استغفار سے بے اعتنائی نہیں کرسکتا- اسی مسجد کا ذکر ہے- میں جمعہ کی نماز کے بعد بیٹھا ہی تھا کہ ایک مسافر آگے بڑھا اور اس نے کہا میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں اگر اجازت ہو تو پوچھوں - میں نے کہا- پوچھیں- کہنے لگا کشتی میں انسان کس لئے سوار ہوتا ہے؟ جونہی اُس نے یہ سوال کیا معاً میرے ذہن میں یہ بات آگئی کہ یہ شخص ان نام نہاد صوفیوں کی غلط اصطلاحات کے چکر میں پھنسا ہوا ہے جنہوں نے یہ ڈھکوسلا بنا رکھا ہے کہ ایک شریعت ہوتی ہے اور ایک طریقت- جب تک انسان دائرہ شریعت میں رہتا ہے اُس وقت تک تو اُسے عبادت کی ضرورت رہتی ہے مگر جب وہ طریقت کے مقام پر پہنچ جاتا ہے' اسے کسی عبادت کی ضرورت نہیں رہتی- میں نے سمجھ لیا کہ اگر میں اسے یہ کہوں گا کہ کشتی میں بیٹھنے سے انسان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ کنارے تک پہنچ جائے- تو یہ شخص فوراً کہہ دے گا کہ نماز روزہ اسی لئے ہیں کہ انسان خدا تک پہنچ سکے جب خدا مل گیا تو پھر نماز روزے کی ضرورت کیا ہے؟ کیا منزلِ مقصود پر پہنچ کر بھی کوئی شخص کشتی میں بیٹھا رہتا ہے یا دوست کے گھر پہنچ کر بھی سواری کو نہیں چھوڑتا- پس اُس کے سوال کرتے ہی یہ تمام باتیں مجھ پر کُھل گئیں اور میں نے اُسے صرف یہ جواب دینے کی بجائے کہ کشتی میں انسان اس لئے سوار ہوتا ہے کہ وہ کنارے پر پہنچے' یہ جواب دیا کہ کشتی میں سوار ہونے کی اصل غرض کنارے پر پہنچنا ہے پس اگر دریا سے پار ہونا ہے تو جب کنارہ آئے' اُتر جائے لیکن اگر وہ بے کنار سمندر ہے تو پھر جہاں اُترا ڈُوبا-

پس اللہ تعالیٰ ہمارا ایک ایسا مقصود ہے جس کا قُرب کبھی ختم نہیں ہوسکتا اسی لئے اس کی ذات کو مدنظر رکھتے ہوئے استغفار کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے اور اس لحاظ سے ہر روحانی انسان ایک طرح کامل ہے اور ایک طرح ناقص- جب ہم یہ دیکھیں گے کہ کسی انسان نے اپنی پوری قوتوں سے اللہ تعالیٰ کا قُرب جتنا وہ حاصل کرسکتا تھا' حاصل کرلیا- اور پورے زور سے اپنے دائرہ کے اندر جس مقام پر وہ پہنچ سکتا تھا' پہنچ گیا تو ہم کہیں گے کہ وہ کامل ہے گو مدارج کے لحاظ سے فرق ہوجائے گا- اور گو اللہ تعالیٰ کی ذات کی نسبت سے یہ شخص بھی استغفار سے غافل نہیں ہوسکتا- اب تک اللہ تعالیٰ کے جس قدر بھی انبیاء آئے' ان میں سے ہم کسی کو بھی ناقص نہیں کہتے- ہم یہ نہیں کہتے کہ موسیٰ علیہ السلام ناقص تھے- وہ بھی کامل

تھے اور اپنی طاقت کے لحاظ سے جس قدر کام کرسکتے تھے اور جتنا اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل کرسکتے تھے' وہ انہوں نے حاصل کرلیا- اسی طرح رسول کریم ﷺ بھی کامل تھے- مگر رسول کریم ﷺ نے اپنی طاقتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل کیا اور اس لحاظ سے مدارج میں فرق ہوگیا- ورنہ حضرت موسیٰ علیہ السلام' حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور باقی تمام انبیاء علیہم السلام کامل تھے- اور باوجود اس کے کہ رسول کریم ﷺ سب انبیاء سے بڑھ کر ہیں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ باقی انبیاء ناقص ہیں بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ افضل الرسل ہیں- ہاں کامل سب نبی ہیں- اسی رنگ میں صدیق' شہید اور صالحین کا مقام ہوتا ہے- یہ تمام اپنے اپنے دائرہ میں ایک نقطۂ کمال تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں اور اگر کوشش کریں تو دوسرا مقام بھی حاصل کرسکتے ہیں- ایک دوسری جماعت کے طالب علم سے جب پوچھا جاتا ہے کہ ۱۰+۱۵+۱۶ کتنے ہوتے ہیں- اگر وہ ۴۱ کہہ دے تو اسے انعام دیا جاتا ہے- لیکن انٹرنس میں پڑھنے والا لڑکا اس سے بہت زیادہ باتیں حساب کی بتاتا مگر فیل ہوجاتا ہے- اس کی وجہ یہی ہے کہ دوسری جماعت کے لڑکے کا مقامِ کمال اور ہے اور دسویں جماعت کے لڑکے کا مقامِ کمال اور- دوسری جماعت والا دسویں جماعت کے فیل شدہ لڑکے کے مقابلہ میں جاہل ہے- مگر اپنی جماعت کے دوسرے ساتھیوں کے مقابلہ میں اگر زیادہ ہوشیار ہو تو کامل ہے- اور جب وہ سوال حل کرلیتا ہے تو ہم اُسے فرسٹ کہتے ہیں بلکہ انعام کا مستحق قرار دے دیتے ہیں لیکن جب ہم اُسے فرسٹ کہتے ہیں تو اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقام کے دوسرے لڑکوں کے مقابلہ میں کامل ہے- یہی حالت روحانیات کے مقام میں انبیاء سے نچلے درجہ کے لوگوں کی ہوتی ہے- جس طبقہ میں وہ ہوتے ہیں اس میں تو وہ کمال حاصل کرلیتے ہیں لیکن اگلے طبقہ کے لحاظ سے ناقص ہوتے ہیں اور جب تک وہ مزید تبدیلی پیدا نہ کریں اور ایک جماعت سے دوسری جماعت میں ترقی نہ کریں' اُس وقت تک دوسرا کمال حاصل نہیں ہوسکتا- مگر جماعت کی ترقی کس طرح ہوا کرتی ہے؟ کبھی تم نہیں دیکھو گے کہ دوسری جماعت میں پڑھتے پڑھتے ہی ایک لڑکے کو انٹرنس کی لیاقت حاصل ہوجائے بلکہ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ دوسری سے ترقی کرکے تیسری میں جائے اور تیسری سے چوتھی میں یہاں تک کہ دسویں جماعت تک پہنچ جائے لیکن اگر وہ اس طرح نہ کرے اور دوسری ہی جماعت میں دس سال بیٹھا رہے تو اسے انٹرنس کی لیاقت حاصل نہ ہوگی- پس ترقی ہمیشہ قدم آگے بڑھانے

سے ہوتی ہے نہ کہ ایک مقام پر ٹھہرے رہنے سے۔

میں سمجھتا ہوں ہماری جماعت کے بعض احباب بھی اپنی روحانی ترقی میں بجائے قدموں سے اندازہ کرنے کے سالوں سے اندازہ کرتے ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ ہمیں دس یا بیس سال گزر گئے مگر ہمیں مزید روحانی ترقی حاصل نہیں ہوئی۔ حالانکہ اصل سوال یہ نہیں کہ کتنے سال ہوگئے بلکہ یہ ہے کہ انہوں نے سال یا چھ مہینے میں کس قدر روحانی ترقی کے لئے جدوجہد کی۔ اگر وہ اس رنگ میں اپنی روحانی ترقی کا اندازہ کرتے رہیں تو انہیں ایک کمال کے بعد دوسرا کمال حاصل ہوتا چلا جائے گا اور اگر نہیں کریں گے تو خواہ کتنے سال گزر جائیں وہ ایک ہی مقام پر کھڑے رہیں گے۔ اس غرض کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے یہ تحریک کی تھی کہ دوست سالکین میں نام لکھوائیں۔ جس سے میرا یہ مقصد تھا کہ جماعت میں ایسے لوگ پیدا ہوجائیں جنہیں روحانیت میں ترقی کرنے کی فکر ہو۔ ورنہ یہ مطلب نہیں تھا کہ میں کوئی خاص گُر یا وظیفہ بتادوں گا جس کے ماتحت وہ ایک دم روحانی مدارج طے کرلیں گے بلکہ جماعت میں یہ احساس پیدا کرانا مدنظر تھا کہ وہ ترقی کرے اور ترقی بھی طبعی طریق کے ماتحت ہو مثلاً طبعی طریق یہ ہے کہ ایک قدم کے بعد دُوسرا قدم اُٹھایا جائے۔ اور علم میں طبعی ترقی اس طرح ہوتی ہے کہ ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب پڑھی جائے۔ اس طرح اگر کوئی شخص اپنی روحانی اصلاح کرتا اور اس طبعی طریق کو مدنظر رکھتا ہے۔ پہلے ایک نقص کو دور کرتا اور جب وہ دور ہوجاتا ہے تو دوسرا نقص مٹانے کی کوشش کرتا ہے اور تدریجاً روحانی مقامات کو طے کرتا چلا جاتا ہے تو وہ کامیاب ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص بجائے قدم بقدم چلنے کے سالہاسال ایک ہی مقام پر ٹھہرا رہے اور خیال کرے کہ کوئی شخص اُسے اُٹھا کر معراجِ کمال تک پہنچادے گا تو یہ نہیں ہوسکتا۔ پس میرے یہ کہنے کا کہ سالکین میں اپنے نام لکھائے جائیں یہ مطلب تھا کہ احباب اپنے اپنے نقائص کا پتہ لگائیں اور اُن کی اصلاح کریں۔ اور نقائص معلوم کرنے کے دو طریق ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ اپنے نفس کا محاسبہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ میرے اندر کیا کیا نقائص ہیں۔ دوسرے اس امر پر غور کیا جائے کہ غیر اس کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ پھر غیروں میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک منصف مزاج دوسرے غیرمنصف' غیرمنصف انسان بہت جھوٹ بولتا ہے مگر کبھی اس کی بات میں بھی سچائی ہوتی ہے۔ اور منصف مزاج انسان کی بات سے تو بہت کچھ فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔ باقی اگر صرف اپنی

ذات کا محاسبہ آپ کیا جائے تو اس میں بہت سے انسان غلطی کھا جاتے ہیں۔ حضرت خلیفہ اول کا ایک لطیفہ مشہور ہے۔ انہوں نے ایک بوڑھے آدمی کے متعلق جس پر انہیں بہت حسن ظن تھا سنا کہ وہ گالیاں دیتا اور سخت بدزبانی کرتا ہے۔ آپ نے اُسے بلایا۔ اور فرمایا مجھے یہ سن کر تعجب ہوا ہے کہ آپ کو سخت کلامی کی عادت ہے' اگر یہ نقص ہو تو اسے دور کرنا چاہیئے۔ وہ بے ساختہ ایک نہایت ہی گندی گالی دے کر کہنے لگا کون خبیث کہتا ہے کہ میں گالیاں دیتا ہوں۔ حضرت خلیفہ اول فرمانے لگے۔ مجھے معلوم ہوگیا یہ شکایت کرنے والے کی غلطی تھی۔ آپ کو گالیاں دینے کی عادت نہیں۔ تو انسان اپنے متعلق چونکہ بعض دفعہ صحیح اندازہ نہیں کرسکتا' اس لئے اگر کوئی غیر کسی نقص پر اطلاع دے تو بجائے اس سے لڑنے کے انسان کو چاہیئے کہ وہ غور کرے اور سوچے کہ آیا مجھ میں یہ نقص پایا جاتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ ہر بات پر اس طرح غور کرنے کا عادی ہوجائے گا تو اپنی اصلاح میں ایک دن ضرور کامیاب ہوجائے گا۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ دشمن کے منہ سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جو واقعہ میں درست ہوتی ہیں اور میں تو عموماً دشمنوں کی باتوں سے ہی اپنے سلسلہ کی ترقی کا اندازہ لگایا کرتا ہوں۔ پس بہترین طریق یہ ہے کہ اپنے خلاف اگر کسی سے کوئی بات سنی جائے تو انسان رنج نہ کرے بلکہ سن لے اور اس پر غور کرے۔ اگر غور کرنے کے بعد اسے معلوم ہو کہ یہ نقص مجھ میں نہیں پایا جاتا تو غور کرنے سے اس کا کیا نقصان ہو جائے گا۔ مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ تم جھوٹ بولا کرتے ہو تو غور کیا جائے کہ واقعی مَیں جھوٹ بولا کرتا ہوں یا نہیں۔ اگر جھوٹ بولنے کی عادت نہیں تو اسے خوشی ہوگی کہ مجھ پر غلط اتہام لگایا گیا۔ اور اگر یہ بات صحیح ہوگی تو غور کرنے پر اسے اپنی اصلاح کا موقع میسّر آجائے گا اور وہ سمجھ لے گا کہ جھوٹ کی بعض شقیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں گو میں غلطی سے جھوٹ نہیں سمجھتا مگر لوگ انہیں جھوٹ سمجھتے ہیں۔ پس کسی کی بات پر بُرا نہ منایا جائے بلکہ اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی جائے۔ ہاں بعض جگہ بُرا منانا بھی ضروری ہوتا ہے مثلاً طالب علم جب استاد کو کسی نقص کی طرف توجہ دلائے تو اس لحاظ سے کہ ادب اور نظام کا تقاضا ہے کہ شاگرد بے باک نہ ہو' اُستاد کا فرض ہے کہ وہ اسے ڈانٹے لیکن گھر میں آکر اس کی بات پر بھی غور کرے اور سوچے کہ آیا یہ نقص مجھ میں پایا جاتا ہے یا نہیں اور اگر پایا جاتا ہو تو اصلاح کرلے۔ گویا دونوں فرائض کو ادا کرے۔ ایک فرض کے مطابق وہ طالب علم کو ڈانٹ دے۔ اور دوسرے کے مطابق سوچ لے

کہ شاید طالب علم کی بات میں سچائی پائی جاتی ہو- لیکن یہ ضروری بات ہے کہ جب کسی کو اس کے عیب سے اطلاع دی جائے تو اس میں اس کی تحقیر مدِّ نظر نہ ہو اور نہ اسے لوگوں میں بدنام کیا جائے بلکہ علیحدگی میں اسے سمجھایا جائے- اور اگر علیحدگی میں سمجھانے پر بھی وہ بُرا مانے تو پھر اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے- لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات آپ کی رائے غلط ہو- آپ ایک شخص میں کوئی عیب سمجھتے ہوں حالانکہ حقیقت میں وہ عیب اس میں موجود نہ ہو- مگر چونکہ آپ جو کچھ دوسرے سے کہیں گے خیرخواہی اور نیک نیتی سے کہیں گے فتنہ انگیزی آپ کا مقصد نہیں ہوگا' اس لئے آپ کو بھی ثواب ہو جائے گا- اور اگر دوسرا شخص آپ کی بات سن لے گا تو اس کے لئے بھی مفید ہوگا کیونکہ اگر نقص ہوگا تو اصلاح کرے گا اور اگر نہیں ہوگا تب بھی اس خیال سے استغفار کرے گا کہ شاید مجھے کسی اور قصور کی بناء پر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہہ ہوئی ہے- یہ طریق ہے جس کے ماتحت سالکین کو کام کرنا چاہیئے- اول اپنے نفس کا آپ محاسبہ کریں اور پھر دوسروں کی رائے سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں- مگر اس بارے میں یہ امر یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ کسی انسان کے عام حالات دیکھ کر نیک نیتی سے جو رائے پیدا ہو جائے وہ بیان کرنی چاہیئے-

تجسّس اسلام میں سخت منع ہے [۱]- جو نقص آپ ہی آپ سامنے آجائے' تو اس کے متعلق محبت اور پیار سے دوسرے کو سمجھایا جائے اور کہہ دیا جائے کہ مجھے آپ میں یہ نقص نظر آیا ہے- ممکن ہے اس میں میری غلطی ہو مگر چونکہ میرا اخلاقی فرض تھا کہ آپ کو بتا دیتا اس لئے آپ تک میں یہ اطلاع پہنچاتا ہوں بدنیتی سے نہیں بلکہ نیک نیتی اور اخلاص سے میں یہ بات کہہ رہا ہوں- ہر انسان میں کمزوریاں ہوتی ہیں اور اپنے متعلق بھی مجھے یقین ہے کہ مجھ میں بیسیوں قسم کی کمزوریاں پائی جاتی ہیں اور میں انہیں دور کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں لیکن آپ کے متعلق میرے دل میں یہ احساس ہے کہ آپ میں فلاں نقص ہے ممکن ہے یہ غلط ہو لیکن اگر اس میں کسی حد تک صحت پائی جاتی ہو تو مجھے توقع ہے کہ آپ اسے دور کرنے کی کوشش کریں گے- میں نے دیکھا ہے بیسیوں آدمی مبالغہ کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں- وہ جب بھی بات کرتے ہیں اصل واقعہ سے بہت بڑھا کر بیان کرتے ہیں لیکن آجکل چونکہ یہ رواج ہوچکا ہے کہ جب کوئی شخص بات کرے تو اسے خاموشی سے سن لیا جائے' اس لئے کوئی انہیں نہیں روکتا حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ فلاں اپنی باتوں میں مبالغہ

کرنے کا عادی ہے۔ اور اگر کبھی کوئی شخص ہمت کرکے اسے کہہ دے کہ یہ بات یوں نہیں بلکہ یوں ہوئی تھی ممکن ہے اس میں میری غلطی ہو لیکن مجھ پر اثر یہی ہے کہ آپ بات کرتے وقت بہت مبالغہ سے کام لیتے ہیں تو کئی لوگوں کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ مبالغہ جھوٹ کا پہلا قدم ہوتا ہے اس لئے یہ عیب بھی دور کرنے کے لائق ہے۔ اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے دوسرے کا عیب اس رنگ میں بیان کیا جائے کہ اسے محسوس ہو کہ میری تذلیل نہیں کی جارہی بلکہ خیرخواہی سے مجھے ایک بات کہی جارہی ہے اور اس عیب کا بیان کرنا خود اس کیلئے شرمندگی کا باعث ہورہا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ میں عیب بیان کرکے اپنے آپ کو دکھ پہنچا رہا ہوں۔ ایسی حالت میں اگر دوسرا شخص بُرا بھی منائے تو نصیحت کرنے والا خداتعالیٰ کے حضور گنہگار نہیں ہوگا۔

(الفضل یکم مارچ ۱۹۳۴ء)

لہ الحجرات: ۱۳